

عبدالرشاد

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور

ڈاکٹر روبینہ شاہین

پروفیسر، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور

## فیض کا انقلابی آدرش: نقش فریادی کے تناظر میں

### **Abstract:**

Literature is a reflection of life. Not only it depicts about the existing society but also tell about the world of briability i.e what ought to be or what might be. The research article regarding Faiz's revolutionary ideas in perspective of his first poetry collection "Naqsh.e Faryadi" has been evaluated that how the poet made people think, raised their hopes and motivated them to stand against the imperialism and other humiliating systems. By the virtue of these revolutionary thoughts, the poet lives as the celebrated champion of the oppressed. Faiz Ahmad Faiz, the writer of eight poetry books was a notable member of the progressive writers movement (PWM). He was awarded "Lenin peace prize" by the Soviet Union in 1962. The research article has evaluated Faiz's poetry in the perspective of "Naqsh.e Faryadi" that how he addressed the tyranny of the oppressor and wanted the downtrodden to rise against the tyranny and the despicable exploitation.

### **Keywords:**

Faiz, Poetry, Revolution, Exploitation, Capitalism, Proletariat, Devastation, Conspiracies, Deep State Politics

فیض کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ اقرار پسند معاشرے میں بد صورتی کے ہر حوالے کی نفی کے باعث سقراط، مسیح، امام حسین، تھامس مور اور کارل مارکس جیسے اکابرین (جو زندگی کو جمہوری قدروں پر نچھاور کرنے والے

تھے) کی اتباع میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

ترقی پسند شاعر فیض ذہنی، فکری اور سماجی انقلاب کو آدرش بنا کر روایت کی جگہ درایت، تقلید کی جگہ اجتہاد، منقولات کی جگہ معقولات اور قنوطیت کی جگہ رجائیت کے علمبردار رہے۔ آپ نے غلامی کو ٹھکرا کر تحصیل ذات، تخلیق ذات، تزئین ذات اور عالمگیر انسانی معاشرے کو شرفِ انسانیت اور مسندِ آدم کا معراج گردانا۔ انہوں نے انسانی قوسِ قزح کے خوبصورت رنگوں کے لیے رسوم و قیود، رعوت و خشونت، جبر و قہر، ہوسِ اقتدار، ایذا رسانی، طنز و استہزاء اور کورانہ تقلید کو ناسور سمجھتے ہوئے آزادی، امن، شرفِ آدم اور خلافتِ انہویوں کے نکھار کا پیغام دیا۔

فیض کی شاعری اور زندگی اس آدرش کا عملی نمونہ رہی۔ آپ کی شاعری کا پیغام سمجھے بغیر ارتقاءِ حیات اور خصوصاً طبقاتی نظام کے باعث اکثریتی انسانی آبادی کے ساتھ روار کھے گئے استحصالی رویوں کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس آدرش کے حصول کے لیے آپ کی اپنی زندگی میں بے شمار انقلابات (فاشزم کے خلاف فوج میں ملازمت، روزنامہ امروز اور پاکستان ٹائمز سے بطور مدیر و ابستگی، مختلف کالجوں میں تدریسی فرائض کی انجام دہی، لیلائے وطن کے دروہام کی تزئین کی خاطر چار سال سے زیادہ عرصہ پابند سلاسل رہنا، آمریت کے دوران سمجھوتے کی بجائے خود ساختہ جلا وطنی کو ترجیح دینا اور واپسی کے بعد اپنے آخری ایام کو بھی غبارِ ایام کی صورت دیکھنا وغیرہ) انہیں ایک رزمیہ داستانوی ہیرو کی صورت ہمارے دلوں پر نقش کر جاتے ہیں۔

فیض کی شاعری میں موجود مزاحمت کس طرح انسانی حیات کے جمالیات کے تحفظ اور فروغ کے لیے ضروری بن جاتا ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سبط حسن لکھتے ہیں:

”اگر کسی کو غلامی، افلاس، جہالت، توہم پرستی، بے انصافی اور دوسری سماجی برائیوں کے اسباب معلوم ہو جائیں اور اس کو انسان کی قوت پر اعتماد ہو تو پھر بیچارگی کا ماتم نہیں کرے گا بلکہ ان اسباب کو دور کرنے کی جدوجہد کرے گا۔ یہ خرابیاں سماجی عمل سے پیدا ہوتی ہیں لہذا سماجی عمل ہی سے دور ہو سکتی ہیں۔ ہیگل نے کیا خوب کہا تھا کہ آزادی جبر کے قانون کو سمجھنے کا نام ہے خواہ جبر قدرت کا ہو یا معاشرے کا، جبر کے ادراک ہی سے مجبوری کی زنجیریں ٹوٹی رہتی ہیں اور اختیار کے درکھلتے ہیں۔ بشر ہزاروں سال سے ہوا میں اڑنے لگا اور اب تو زمین کی پا گرفتگی سے آزاد ہو کر چاند تک پہنچنے لگا ہے“ (۱)

۱۳ فروری ۱۹۱۱ء سے ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء تک کا یہ سفر ہمیں اس فیض سے متعارف کراتا ہے جو ہر اس نظام کی نفی کرتا ہے جو انسان کو غلام بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ ان کے آٹھ شعری مجموعوں اور نثری تصانیف مع پاکستان ٹائمز اور امروز کی ادارت ہمیں یہ شعور دے جاتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے جادوئی، پرکشش اصطلاحات جیسے آزادیِ اظہار، آزاد منڈی (Free Market) اور آزاد دنیا کس طرح کمزور طبقوں کا استحصال کرا کے انہیں ہمیشہ کی غربت اور نہ ختم ہونے والی جنگوں کے منہ دھکیل میں دھکیلے گئے۔ انصاف، آزادی اور خدا ترسی جیسے الفاظ کا سہارا لے کر پہلے ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری ہتھیاروں کے استعمال سے نسل کشی کی گئی اور پھر یہ سلسلہ کوریا، کیوبا، لاؤز، ویتنام، کمبوڈیا، لیبیا، نکارا

گووا، عراق، صومالیہ، یوگوسلاویہ اور افغانستان پر خطرناک ہتھیاروں کے استعمال اور حملوں کی صورت و وسعت پاتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں کیے گئے خفیہ عسکری آپریشنز، تختہ اللہ کی سازشیں اور کارروائیاں جو آمروں کی حمایت اور اسلحہ فراہمی کے سلسلے میں تھیں، ہمارے سامنے سرمایہ دارانہ نظام کے مکروہ عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہیں۔

فیض کی شاعری کا یہی پیغام جو ہمیشہ رجائیت کے حوالوں پر مبنی رہا آپ کے شعری مجموعوں نقش فریادی، دست صبا، زندان نامہ، دست تہ سنگ، سروادی سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر اور غبارِ ایام کی صورت عوام کی آواز بن کر مقبول خاص و عام کا سند حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ”لینن امن انعام“ کے ذریعے عالمی سطح پر بھی سند و پذیرائی حاصل کر گئے۔

فیض نے کلاسیکی روایت کو لے کر نئے معنوی امکانات اور کمال تخلیقی لمس کے باعث ان مجموعوں میں اپنی خلاقی ذہنیت کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ فیض کی شاعری کو سمجھنے کے لیے روایتی شاعری میں موجود تثلیث یعنی عاشق، معشوق اور رقیب کی نئی معنویت کا حوالہ دیتے ہوئے اس طرح پیش کر گئے ہیں:

- 1- ”عاشق: (مجاہد، انقلابی) معشوق (وطن، عوام) رقیب (سامراج، سرمایہ داری)
- 2- عشق: (انقلابی ولولہ، جذبہ حریت) وصل (انقلاب، آزادی، حریت، سماجی تبدیلی) ہجر، فراق (جبر، ظلم، استحصال کی حالت یا انقلاب سے دوری)
- 3- رند (مجاہد، انقلابی، باغی) شراب، میخانہ، پیالہ، ساقی (سماجی اور سیاسی بیداری کے ذرائع) محتسب، شیخ (سامراجی نظام، سرمایہ دارانہ ریاست، عوام دشمنی حکومت)
- 4- جنون (سماجی انصاف، انقلاب کی خواہش، تڑپ) حسن، حق (سماجی انصاف، انقلاب، سماجی سچائی) عقل (مصلحت کشی، منفعت اندیشی، جاہر نظام، دفتر شاہی یا عسکری نظام سے سمجھوتہ بازی)
- 5- مجاہد (مجاہد آزادی، انقلابی) زندان، دارورسن (سیاسی قید، جان کی قربانی) حاکم (سامراج، سرمایہ داری، تاناشاہی، عسکری نظام)
- 6- بلبل، عندلیب (جذبہ قومیت، حریت سے سرشار شاعر، انقلابی) گل (سیاسی آدرش، نصب العین) گلچیں، قفس (سیاسی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ یا رکاوٹ ڈالنے والے عوامل)، (۲)

فیض کے انقلابی آدرش کو جب ہم ان کے پہلے شعری مجموعے ”نقش فریادی“ کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں تو بیسویں صدی کے مختلف واقعات، حادثات اور انقلابات کو سمجھنا از حد ضروری ہو جاتا ہے۔ فیض کا شعری مجموعہ ”نقش فریادی“ اس دور کے بڑے انقلابات یعنی جنگ عظیم اول، شدید عالمی کساد بازاری (Great Depression) ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۹ء، عظیم بالشویک روسی انقلاب جو ۱۹۱۷ء کو لینن کی قیادت میں دنیا نے دیکھا اور ہندوستان میں آزادی اور

سامراجی نوآبادیات کے خلاف مزاحمتی تحریکیں کا احاطہ کرتا ہے۔

نظمیں ”مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ“، ”ریقب سے“، ”کتے“، ”بول“، ”چندر روز اور مری جان“، ”سرود“ اور ”موضوع سخن“ کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ طبقاتی نظام زندگی کا شعور ہی انسان کو ان بیانیوں کی نفی کا علمبردار بناتا ہے جو انسان کے وضع کردہ بیانیوں، رنگ، نسل، مذہب اور جغرافیہ کی آڑ میں منظم محدود بورژوا طبقہ اکثریتی انسانی آبادی کو آپس میں تقسیم کر کے وسائل پر اپنی گرفت کو استحکام بخشتا ہے۔

جمالیات کے لبادے میں حقیقت کی طرف آنے کا یہ سفر فیض کی اکثر نظموں میں تارحریر و رنگ کی صورت پیش کرنے کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

”رومان کے راستے حقیقت کی طرف آنے کا عمل فیض کے ہاں بہت واضح ہے اور فیض کو اس سلسلے میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ فیض کے اس اقدام کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ اس نے شعر کو اس خالص رومانی فضا سے نجات دلائی جس نے اختر شیرانی کے اثرات کے تحت نظم کو محدود کر دیا تھا۔ فیض کی یہ عطا قابل ذکر ہے کہ اس نے عرفان ذات کی حدود کو عرفان کائنات کی حدود تک پھیلا دیا۔ اور اپنے ذاتی غم کو کائناتی غم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی..... نظم میں تحرک اور کشادگی کی جو آمیزش فیض کے ہاتھوں ہوئی، اس کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔“ (۳)

فیض کی ہر نظم غم جاناں کے تذکرے سے شروع ہو کر غم دوراں کا احاطہ کر کے ہمارے سامنے ایک مکمل زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ فیض جب اپنے گہرے تاریخی شعور اور مارکسی مطالعے کے تناظر میں حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہیں تو آپ آج کی دنیا کے عالمی دانشوروں نوم چومسکی، ہوارڈ زن، جان برجر، آرون دھتی رائے، ایڈوارڈ وگلینو، رچرڈ وولف اور ایڈورڈ سعید جیسے انسان دوست اور عالمگیر انسانی معاشرے پر یقین رکھنے والوں کے اس تاج میں قیمتی ہیرے کی صورت اپنی نمایاں چمک اور قدر و منزلت کے باعث ہزاروں کو اپنی طرف متوجہ کر جاتے ہیں۔

نظم ”کتے“ کا علامتی پیرائے اظہار آج بھی غلام ذہنیت کو جگانے کے حوالے سے ایک تازیانے سے کم نہیں۔ یہ نظم اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کا بھی احاطہ ہے جو عوام میں پھوٹ پیدا کر کے آپس میں اس طرح لڑاتی ہے کہ وہ حرص و ولالچ اور معمولی مقاصد کے حصول میں اپنی توانائیاں زائل کر کے اصل دشمن کی شناخت کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کی طاقت کو دوام بخشتے ہیں۔ نظم ”کتے“ کی گہری معنویت کو پانے کے لیے آرون دھتی رائے کے اس اقتباس کو پیش کرنا ضروری ہے جو انگلستان کے مشہور زمانہ وزیر اعظم اور جنگ عظیم دوم کے ہیرو ”سروٹیل چرچل“ کے ۱۹۳۷ء کے اس بیان سے متعلق ہے جو انہوں نے فلسطین کے حوالے سے دیا تھا:

”میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ ایک کتا اگر کسی گھوڑے یا گائیکی کھری میں لیٹا ہوا ہو تو وہ کھری کی ملکیت کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ کتا اس کھری میں کتنے ہی برسوں سے محو استراحت ہو، میں اس کی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ امریکہ کے سرخ ہندیوں کے ساتھ تاریخی بیانصافی کی گئی ہے یا

آسٹریلیا کی سیاہ فام اقوام کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ اس طرح مجھے اس دلیل میں بھی کوئی صداقت نظر نہیں آتی کہ اگر کسی طاقتور نسل نے، کسی اعلیٰ قوم اور عالمی سطح کے دانشور گروہ نے اگر مقامی لوگوں سے ان کے تاریخی ٹھکانے چھین لیے ہیں تو یہ کوئی زیادتی کی بات ہے۔“ (۴)

فیض کی نظم ”بول“ گویا آپ کے آدرش کو سمجھنے کے حوالے سے ایک منشور کی حیثیت لیے ہوئی ہے۔ ارتقاء حیات کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ”بول“ یعنی مزاحمت اور انقلاب ہی نے پہلے غلاموں کو مالک کے چنگل سے نجات دلادی اور پھر جاگیر داری کا سورج کسانوں کے بول کے باعث غروب ہوا۔ اگر آج آزادی رائے اور سوچ کو بروئے کار لایا جائے تو سرمایہ دار کی شکل میں موجود منظم بورژوا کے استحصال سے انسانوں کو نجات دلا کر وسائل کی مساویانہ تقسیم کے ذریعے دنیا کوارضی جنت کا نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔ یہی ”بول“ دراصل وہ شعور تھا جس نے پہلے امریکہ کو سامراج انگلستان کے تسلط سے آزادی دلادی اور بعد میں نسلی امتیاز کا خاتمہ ابراہم لنکن کے دور میں ممکن بنادیا۔

مارٹن لوتھر کنگ نے اس وقت امریکی ایوان اقتدار کو ہلا کر رکھ دیا جب آپ کی توانا آواز (I Have a Dream) نے سیاہ فام امریکیوں کو وہ شعور دیا جس کے سامنے کوئی مزاحمت نہیں ہو سکتا۔ یہی بول ہی ویت نام پر امریکہ کی جارحیت کو روکنے کا سب سے موثر ہتھیار بنا۔

اس طرح شدید کساد بازاری کے دوران یونین لیڈروں نے امریکی صدر روز ویلٹ کو اس بات پر مجبور بنادیا کہ وہ سرمایہ داروں پر ٹیکسوں کی شرح آخری حدوں تک بڑھا دے تاکہ عام لوگوں کو حق زندگی سے محروم نہ کیا جائے۔ بول کا یہ پیغام کس طرح فیض کی شاعری کا وظیفہ بنا ہے، اس کے لیے فیض کے ادبی مسلک کا جاننا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

”شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے جلد کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کے فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دھل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر..... اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔“ (۵)

نظم ”موضوع سخن“ بھی جمالیاتی پیکروں کو تراش کر حسین دنیاؤں کا مرقع سامنے لانے کے بعد جمالیات کے راستے میں مزاحمت تو توں بھوک، افلاس اور خوف جیسی قباحتوں کا تذکرہ کر کے ہمیں ہر صورت امن اور آزادی کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے۔ فیض کی شاعری کا وہ آدرش جو محدود انسانی طبقے یعنی سرمایہ دار کے ہوس ولاچ اور جنگی جنون کے خلاف رہا آج کی دنیا کے دانشوروں کی ہر تقریر و تحریر میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ آرون دھتی رائے امریکی حکومت کی بجائے امریکی عوام سے اس طرح مخاطب ہیں:

”آپ مزاحمت کی شاندار تاریخ کے امین ہیں۔ آپ کو یہ یاد رکھنے کے لیے فقط ہوا رڈ زکی کتاب ”امریکہ کی عوامی تاریخ“ (A People History of the United States) کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے سینکڑوں اور ہزاروں لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بہت طاقتور پروپیگنڈے کو ناکام بنایا ہے اور اپنی حکومت کے خلاف بڑی سرگرمی اور جرات سے لڑ

رہے ہیں۔ امریکہ میں حد سے بڑھتی ہوئی حب الوطنی کی فضا میں امن و انصاف کے لیے جدوجہد کرنا کسی عراقی، افغانی یا فلسطینی مجاہد سے کم بہادرانہ کام نہیں ہے جو اپنی مادر وطن کے لیے جان و تن کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اگر آپ سینکڑوں، ہزاروں، بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حق و انصاف کی اس جنگ میں شریک ہوتے ہیں تو پوری دنیا خوشی سے آپ کا استقبال کرے گی اور آپ محسوس کریں گے کہ سفاک ہونے کے مقابلے میں شریف النفس ہونا کس قدر خوبصورت ہے اور خوفزدہ ہونے کی نسبت مطمئن اور محفوظ ہونا کتنی اچھی بات ہے۔ تنہا ہونے کی بجائے دوستوں کی صحبت میں ہونا اور نفرتیں پالنے کی بجائے محبتوں کو پروان چڑھانا کتنی اصلی اور کھری بات ہے۔“ (۶)

فیض کا انقلابی آدرش ہمیشہ امن کا متلاشی رہا۔ انہوں نے جمالیات کے تحفظ کے لیے بد صورتی کے راستے میں مزاحم ہونے کو شرف انسانیت خیال کیا۔ ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن انعام کی پر شکوہ تقریب میں فیض اپنے آدرش کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

”امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، لہن کا آئچل ہے اور بچوں کے ہنسیا تھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم، اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے انسانیت کی ابتداء سے اب تک کے ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسر عمل اور برسر پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی و زوال، روشنی اور تاریکی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے فرق بھی ہے۔ دور حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے، نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں امن آدم کی بقا اور فنا، بقا اور فنا، ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دار و مدار ہے..... تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانتدار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو۔ یہ ہم اور راکٹ، توپ اور بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کی بجائے سب مل کر تسخیر کا نجات پر چلو۔“ (۷)

فیض نے محمود الظفر اور رشیدہ جہاں کی وساطت سے ”کیونٹ مینی فیسٹو“ کا مطالعہ کر کے مارکس کے نظریات کی روح کو سمجھ لیا اور اپنی ذات کی محدود دنیا سے نکل کر وسیع انسانی برادری کا غم اپنا لینے پر قادر ہو گئے۔ فیض لکھتے ہیں:

”پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں ہر حال گرد و پیش کے تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سودمند فعل ہے کہ انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود، بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سیاست کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتداء نقش فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے ”مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ۔“ (۸)

فیض اس شعری مجموعے میں اپنے انقلابی آدرش کو مخصوص لفظیات اور تراکیب کے موثر استعمال کے باعث قاری کو عالم وجد میں لے جا کر اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ لفظیات و تراکیب کا یہ جمالیاتی موقع کلام کی حسن و خوبی کے ساتھ ساتھ معنی کی ترسیل اور ابلاغ کا موثر وسیلہ بھی بن جاتا ہے۔ ”نقش فریادی“ کی تراکیب آبشار سکوت، آلام کی گرد، آئینہ دل، آوازِ پا، اکٹھی دنیا، اندوہ نہانی، احساسِ ذلت، انتظارِ بے انداز، بابِ قبول، بزمِ زندگی، بے خواب کواڑ، بے سود عبادت، پری خانہ، پر تمکین نگاہیں، تلخ جام، تکمیلِ غم، تلخی مے، جلوہ حسن، جانِ حزیں، جنونِ عشق، چاک گریباں، چشمِ میگوں، چاک دامن، حسنِ دو عالم، حسرتِ دید، حسنِ دلآرا، خزاں رسیدہ تمنا، خوابوں کی مقتل گاہ، دستِ قدرت، دلِ ناکردہ کار، درد کے پیوند، رنگِ پیراہن، رنگِ رخسار، ریلے ہونٹ، رہنِ غم جہاں، ریاضِ زیست، زلف کی موہوم گھنی چھاؤں، سازِ دل، سیالِ تصور، ستواں جسم، سازِ طرب، شاہدِ معنی، شاہِ گدانا، شورشِ گیتی، ضیائے حسن، طبعِ شاعر، ظلم کے بندھن، عرصہ دہر، عہدِ الفت، غرورِ حسن، غایتِ سودوزیاں، فرصتِ گناہ، فسانہ ہائے الم، فکرِ فردا، قحطِ عیش و مسرت، قصہ ہائے فکر و عمل، گناہ نگارِ نظر، لاکھ آرزوئیں، موضوعِ سخن، متاعِ لال و گہر، معصومِ قاتل، ناصبور نگاہیں، نگاہِ دیدہ سرشار، واقفِ لذت، ویرانِ حیات، وسعتِ دید، هجومِ یاس، ہمتِ التجا، یاد ہائے عہدِ ماضی وغیرہ وغیرہ جمالیات کے پیرائے میں قاری کے ذہن و دل کو رنگ و نور سے آشنا کر کے انہیں انقلاب اور مزاحمت کے ہالے کا اسیر بنا لیتے ہیں۔

فیض تاریخ کے جدلیاتی نظام پر یقین کامل رکھنے کے باعث استحصال کے ہر رویے سے خوف زدہ ہونے کی بجائے رجائیت کا پیغام دیتے ہیں۔ انقلابی آدرش کو مجسم صورت میں دکھانے کے باعث انہوں نے شاعری کے ذریعے کو وسیلہ اظہار بنایا۔ ڈاکٹر مبارک اس وسیلہ اظہار کی تحسین ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”مزاحمتی ادب صاحب اقتدار اور ظالم طبقوں کو ہمیشہ خوف زدہ رکھتا ہے۔ ان کے لیے اسلحہ سے زیادہ شاعروں کے نغمے و گیت اور ادیبوں کی تخلیقات ہوتی ہیں۔ اسلحہ کا اسلحہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں مگر مزاحمتی ادب کے جواب میں ان کے پاس کوئی ادب نہیں ہوتا جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے چاہے کتابوں پر پابندیاں عائد کی جائیں، انہیں شاہراہوں پر جلایا جائے اور انہیں نصابِ و ذرائع ابلاغ سے خارج کیا جائے۔ ایسی تحریریں خاموشی سے ہاتھوں ہاتھ پھیلتی رہتی ہیں اور دلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔“ (۹)

اس بحث کا حاصل فیض کے نمونہ کلام کو پیش کر کے ہی بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ نقش فریادی کا مطالعہ ہمیں اس انقلابی نصب العین کے مختلف حوالوں کا ادراک دے جاتا ہے جس کے ذریعے ان کا ذاتی عشق آفاقی حیثیت اختیار کرنے کے باعث ان کو ”ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما“ کی صورت زندہ کر جاتا ہے:

### نظم ”سرو“

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا  
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینا اپنا  
ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کام نہنگ  
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا  
عرصہ دہر کے ہنگامے تہہ خواب سہی  
گرم رکھ آتش پیکار سے سینہ اپنا  
ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل  
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا  
بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت، مت بھول  
ظلمت یاس کو مت سوئپ خزینہ اپنا (۱۰)

### مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات  
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے  
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے  
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے  
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا  
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا  
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم  
ریشم و اطلس و کنوایں میں بنوائے ہوئے  
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم  
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے  
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کچے  
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کچے (۱۱)



### نظم ”رقتب سے“

آکہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے  
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا  
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ  
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے  
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے  
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں  
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی  
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے  
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا  
سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے  
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے  
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں  
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب  
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت  
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے  
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ  
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا (۱۲)

### کتے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے  
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی  
زمانے کی پھنکار سرمایہ ان کا  
جہاں پھر کی دھتکار ان کی کمائی  
نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے  
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے

جو بگڑے تو ایک دوسرے سے لڑا دو  
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو  
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے  
یہ فاقوں سے اکتا کے مرجانے والے  
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے  
تو انسان سب سرکشی بھول جائے  
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں  
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چھبا لیں  
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے  
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے (۱۳)

### بول

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے  
بول ، زباں اب تک تیری ہے  
تیرا ستواں جسم ہے تیرا  
بول کہ جاں اب تک تیری ہے  
دیکھ کہ آہن گر کی دکان میں  
تند ہیں شعلے ، سرخ ہیں آہن  
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے  
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن  
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے  
جسم و زباں کی موت سے پہلے  
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک  
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے (۱۴)

فیض کی یہ توانا آواز جو عظیم انسانی برادری کا آدرش لیے ہوئی ہے، ہمیں نوآبادیات اور ہر استحصالی نظام کے مکروہ عزائم اور ریشم واطلس میں لپٹے بیانیوں کی اصل حقیقت کا شعور دے کر اس انقلاب اور مزاحمت کا حصہ بناتے ہیں جس کی اہمیت کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر ممتاز حسین لکھتے ہیں:

”ہر بڑا ادیب اور ہر بڑا مفکر اپنی غیر معمولی بصیرت رکھنے کے باعث اپنے زمانے کی تاریخی حدود

سے بہت آگے سوچتا ہے۔ وہ کبھی بھی کوئی ایسی بات کہہ اٹھتا ہے جس سے صدیوں کا بننا یا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اس کی پاداش میں اسے پروتھیس کی طرح چٹانوں سے باندھا جاسکتا ہے۔  
برونوں کی طرح اس کو پھانسی دی جاسکتی ہے لیکن اس سے خیال فنا نہیں ہوتا۔“ (۱۵)

## حوالہ جات

- ۱۔ سبط حسن، ادیب اور سماجی عمل، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۰۳
- ۲۔ گوپی چند نارنگ، ادبیات، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری تا مارچ ۲۰۰۹ء)، ص ۵۱-۵۲
- ۳۔ وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۴۵
- ۴۔ ارون دھتی رائے، سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت، (ملتان: سوچلا برائے سماجی تبدیلی، ۲۰۱۲ء)، مترجم: امجد نذیر، ص ۹۰
- ۵۔ فیض احمد فیض، دست صبا، (لاہور: مکتبہ کاروان، س۔ن۔)، ص ۱۰
- ۶۔ ارون دھتی رائے، سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت، ص ۱۶۸-۱۶۹
- ۷۔ فیض احمد فیض، دست تھہ سنگ، (لاہور: مکتبہ کاروان، س۔ن۔)، ص ۱۰-۱۲
- ۸۔ ایضاً، ص ۲۰
- ۹۔ مبارک علی، تاریخ کے بدلتے نظریات، (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۳۸-۱۳۹
- ۱۰۔ فیض احمد فیض، نقش فریادی، (لاہور: مکتبہ کاروان پریس، ۱۹۸۶ء)، ص ۴۹-۵۰
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۶۸-۶۹
- ۱۲۔ ایضاً، ص ۷۶-۷۹
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۹۲-۹۴
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۹۵-۹۶
- ۱۵۔ ممتاز حسین، نقدِ حرف، (کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۵ء)، ص ۱۴۴

